

کشی پالی جنگل

"کاشی۔ او کاشی۔" ابھی اسے سمجھتے میں منہ
می آئے گا تھا کہ کوثر کی آواز سن لی دی۔

"لیا ہے ای؟" اس نے وہیں بینٹھے بیٹھے مت اور
کر کے جواب دیا۔

"تیرے اپے کے آئے کافیم ہو گیا ہے، پھل واپس
آ۔" اس نے پہنچت کی انوئی منڈر سے صحافی کر کا کہ
کی۔ "کھر سے چند قدم آگے کھل کیتیے ہیں تو ہوں چ
اپنے ہم عمر دوستوں کے ہاتھ بیٹھا کپھے کھیل رہا
تھا۔

"نا نہیں ہیں تو ہوں میں روپی دی ہوئی ہے کیا؟ جلدی
آ۔ من ہاتھ پر کھل کر جائیں۔" اس کے پاس پھل کے
تک اسکو لے لے گئے ہیں اور ان کو بھرپور کے

کوثر نے بھی صرف ایک بار آواز دینے رکھا تھا
کیا۔ آخر اس کے پھل واٹلا پا کا شف چھٹھلا کے
انھا۔ غصے کے اطمینان کے طور پر کھینچنے چل سے بے

نیاز پیروں کو زور سے کچڑی میں مار کر اور بھی خلیل ایا۔
ملے کف سے بستی ہوئی تاک کو رکڑ کے صاف کرنے

کی اپنی سی کوشش کی اور لکڑی کے رنگ اڑھے کو اڑ
و خلیل کے اپنے کھر کی تاریک متعفن ڈیوڑھی میں
داخل ہوا۔ روشنی سے ایک دم اندر ہیرے میں آجائے
سے لئتی ہی دیروڑ آنکھیں چند ہی کیے کھڑا رہا۔

"وے کاشی۔" اور سے کوثر اب تک اسے
آوازیں دے رہی تھی۔

"اگر کیا ہوں۔" وہ اپے چلایا جیسے آگر کوئی بست بڑا
احسان کیا ہو۔ اب آنکھیں کھر کی تھم تاریکی سے ذرا
مانوس ہو رہی تھیں۔ صرف چار فٹ لمبی اور ڈیڑھ فٹ

چوڑی۔ اس لال انہوں والے فرش کی ڈرامہ میں
سے کزر کے جانا سی ہام کوئی کے اس کلہات کے
صرف وہی یا آسمانی لوز رکھتے تھے جو اس سے آنے
جانے کے عادی ہوں۔ ورنہ اور کوئی ہو تو اس کا کاشی
خراب ہو جائے۔ اس تدریجی سے دوسرے
بالق ماتحت جس اونچے سے درجے پر رنگ پا کر
رہا۔ کھلکھل کر کو واحد "باتھ روم" تھا جس اس
یعنی غسل کرنے والا بھی تھا۔ لیا ہوا اس کا نام ایسا کہ
لکھا۔ ذرا سی جگہ میں نکلا جھکڑک بھی نہیں تھا۔
پلاسٹک کی بالائی اور اس میں تجھتا نہیں کا یہ خواری
لکھا۔ کھلکھل کر اس کے پاؤں پر اور ان کے پاؤں میں جھیجھی
لکھا۔ ہوش اور ان کو بھرپور کے لے باہم
سے بختے گے لے پرانے کیڑے گول مل کر
ٹھونے گئے تھے جو بڑا چھوڑ رہے تھے۔ ہر ملے
کیڑے کیوٹھنے تھیں کے راستے یہاں با اسلام پا
چکے تھے۔ یہاں سے نکلنے والی نکل ڈیوڑھی سے اپنی
ہوئی گلی میں جاتی تھی اور کی اس جگہ کی بدرو کار اڑتی
اور جو رہی سی کسری ڈیوڑھی سے یہاں رہنے کو اڑتے کیم
تھے پوری ہو جاتی تھی۔ کوثر کھر مغلیں کا ہم کرنی
تھی، واپسی پر چھا چھا کھاتا لے آئی گر میں کے ہم
میں اکثر راستے میں ہی یہ کھاتا خراب ہو جاتا تو کھاتے
کے قابل نکلتا کھالیا جاتا۔ باقی اسی ڈیوڑھی کی نیت نہ تھا۔
پہلے سے گلے سڑے پھلوں کے مزید گلے ہوئے چکا
بو شیاں ڈیجی ہوئی بڑیاں۔ وغیرہ وغیرہ۔

اپنے ماں باپ اور بہنوں کی طرح کافی تھم تاریکی سے ذرا
بدیوار ماحول کا عادی تھا۔ میری بیٹھ کی نیت نہ تھا۔

جاتے گی۔

”وہ دو بے میں تمن کلے آپتے میں ہو گئے تو ہے لات کے ہمارا سارا نام کھانا سے مل کر سارے دن میں اپا کے سکرت کی تو ہمیں بڑی آپا تی بہن اسے بھی اماں! حمادس روپے“ وہ نور نور سے سلوک پر اس میں حساب سے نہ لٹا آنا کو نہ منے گی۔ لذت اشودبے والا سان وہ پسلے ہی چھا بھی گی۔ میں کے دل جسے بصرہاں پر بیوی کی طرح کاشف دانت نہ کر رہا تھا۔

”وے یہ غریب کیا مٹی میں مل کے آپا سے رفع ہو جا کے منہاتھ دھو۔ پو آنے والا ہے“ مل کر میں باہر کے بھی سیاپے کروں ہم مر کے بھی نہ کر لے۔“ باں باں“ مل کے پنچھوں میں نالو۔“

آتے ہی تیرا من چو من چو“

مروفاں نے پھر سے زہر اگھہ کاشف کے لب

علت“ پھیلے گر ساتھی کے رہا۔“ اس کا چھوڑا

اور یہ بھی تھا کہ بالے ہے تم بیٹوں کے لیے

منتوں مراویں سے پیدا ہو ہٹ دالے اکوٹے ہے؟

بھی بانسوں میں پھر لکھارنے کیا تھا، بھی اس کا انتقام

کے لاثن کیا تھا۔ جب وہ مت چھوٹا ہو گا ب شایع بھی

لودیں اخھا کے پھرا ہو۔ کاشف کو تایا کھلی، العبار

تحا۔ ایسا نہ تھا کہ وہ بیٹی کی جانب سے الپا اخھا بھی

اس کی جانب نظر نہ اخھا کے رکھتا تھا۔ دیکھا تھا انکر

آتے ہی دیکھتا تھا انکر کر کھاجانے والی نظروں سے

پوچھتا تھا انکرنے کے بھانے کی کام کی خاطر۔

اسی لیے اس کے آنے سے بھلے کوڑا سے

شلا دھلا، صاف کپڑے پسنا کر لڈا اس بنا کے چاریاں

کرتائیں دے کر بخدا تی مراقب دین عرف بالے کو

کوئی نہ کوئی بہان مل جاتا اس کی ٹھنچالی کرنے کا

لال صابن سے رکڑ کے منہ دھونے کے بعد“ جیتنی

لے کر لکھنے بیٹھ گیا۔

”مانو نے آرچ فیر تھی گاچی کھالی تھی۔“ اس کی

پ آن بھی اسے پڑو کا احساس ہوا ہو تھوڑی ہری تک تو نہ تھی تھا رفت رفت اس کا احساس کم ہوتا جاتا۔ وہ اپنے پکے سمجھ میں چھمی بان کی چنچالی تھی۔ آبیٹل اس سمجھ میں وہ بھی چارپا جوں کی گنجائش تھی۔ اس سمجھ میں رکھی ہاس کی سیر ہمی اور جاتی تھی۔ گھر کے واحد کمرے کے اوپر کی جگہ چھت کا کام دیتی جہاں کوڑ قائم وقت میں پالی جاتی، اس وقت بھی وہ سبزی کی توکری اٹھائے تھے اتر رہی تھی۔“ ایسا پک رہا ہے۔“ اس نے چھلکوں کا ڈھیر دیکھ کر پچھا۔

”لذت کے پھلیاں تو مکافی بھی کی ہیں“ چھپتے کے واسطے لائی تھی۔ نی کڑیو! تم بھی ذرا باتھ ہاں لایا کرو۔ میں باہر کے بھی سیاپے کروں ہم مر کے بھی نہ کر لے۔“ ذرا سی رہ بھی ہیں،“ دنوں مل کے پنچھوں میں نالو۔“

”قید؟“ سب سچھ بڑی پندرہ سالہ تک مزان اور خیلے اُنچ میں مروفاں نے اپنی کو کے والی ناک چڑھا کر کیا۔

”ایک کلوپاٹا“

ہیں اور ایک کھلپی، خوالی یہ مالکن بس دو روپے دینی

ہے۔ کیا فیدہ! اور بخت لگا کے دس روپے بھی نہ سمجھا

لگیں۔ پتہ نہیں تو کیا لیا ہم کیڑا لاتی ہے، بھی سحر

ساؤ کا، بھی سحرے پتے نکلتے کھا سطے، کسکے لئے

حصلے واسطے تو بھی پھلیاں۔ اتنا شوق ہے ان لوگوں کو

مشکل مشکل مہنگی سبزیاں کھانے کا تو آپ بنا لیا

کریں۔ بڑا احسان کرتی ہیں ٹلوکے پیچے دو روپے دے

کے۔“

”تیرے لیے دس روپے کوئی چیز نہیں ہوں گے

گھر بیٹھی ہے تا اور وہ بھی ماں پیو کے سحر۔ میرے سے

پوچھ دس روپے میں آوھا کلودو وہ آجائتا ہے سارے

دن کی چائے کے لیے دس روپے میں پاؤ بھر داں آجائی

ہے، ایک وقت پکانے کے لیے اور دس روپے میں۔“

”باں باں، بڑا کچھ آجائتا ہے دس روپے میں۔“

مروفاں نے ہاتھ ہلا کر کما اور سمجھ میں رکھے چولے کو

نزویک جلایا۔
”تال میں تکس آتا ہائی پکنے کی بو بڑی زبر
لکھی ہے مجھے“ اس نے تاک پر ہاتھ رکھا۔
”لے تو وجہ جی سے ہونے والی زنانہں کی
طرح خرخے دکھارتا ہے“

کوثر نے خشامار کے ایک بے جھکندہ اق کیا بجس
میں اس کے قبیلے کا ساتھ اس کی کم عمر کنواری بیٹیاں
بڑی بے باکی سے دے رہی تھیں۔
منہ پھلا کے بیٹھے کاشت کی نظر بونی دروازے کی
جانب چلی گئی۔ لکڑی کے کواڑیں بے شمار در زمیں اور
سوراخ تھے۔ جن سے باہر کی روشنی اور دھوپ پھجن
پھجن کے راست بناتی پاریک لکیروں کی صورت خم
تاریک ڈبوڑھی میں نظر آتی رہتی تھی۔ اس وقت
اچھے دھوپ دھوں بیکھی تھی۔ مغرب کا وقت بس ہوا
ہی چاہتا تھا، لیکن روشنی کی یعنیکریں اب تک واضح
تھیں۔ جیسے ہی کاشت کی نظر دروازہ پھینپھی گئی اچانک
اسی وقت یہ لکیریں غائب ہو گئیں۔ جیسے کسی نے ان
دھوکوں والی رانی پر جو پھر دھوکہ دیا تھا،
ہوں۔

”ایا!“ اس نے پھنکا رتی ہوئی ہمراڑو شی کی۔ کوثر
کے قبیلے، مروفال کی کمی بھی گرائی کی شوختی اور مانو کی
لعل! بتی جادوے، انہیں ہم کیا سے“ کاشت
نے اس مارکٹیل کے عمل میں دخل دیا۔ ہم مارکٹیل میں
پھری ٹھما کے اس ڈینہ مرلے کے شم کے مکان کو
سوئے ہوئے محل میں تبدیل کر دیا ہو۔ اگئے ہی کے
پالے کے کھنکھارنے کی اواز گویا پھر کسی منتر کا
کام دیا۔ سب بتوں میں جان پڑی۔ کوثر نے سبزی کی
نوکری اس چارپائی کے بیچ سرکالی جمل کا شف اب
اں ہل کر زیر ب انسا سبق دوہر اپا تھا۔ خود وہ انھ کے
کنٹے کھولنے چلی گئی۔ مروفال نے پڑھی پڑھا پڑھے
انھا کے سرپہ رکھا اور انھیوں میں پنے رنگ برلنے چھے
سرعت سے اتار کے چولے کے پیچے چھائے اور
بڑے اشماک کے ساتھ سلوٹ کی پچکی ہوئی ویسی میں
ڈولی ہلانے لگی۔ مانو اپنا آنسوؤں سے تراور مگی سے

جنی دیکھ کے تھجھی والی رانی کو سب سے چھوٹی کی
دکت یاد آئی تو اس نے شکایت لگانے کا موقع ملا تھا
ہے جانے والی مانو کو مٹی کھانے کی عادت تھی۔ بھی
بھی یہ کافی تھی پہ بھیرنے والی ”کاچی“ بھی ہم
کر جاتی۔
”تال مانو نے میری کاچی کھائی سے ابھی پرسوں
ی ڈھلا لی تھا۔“ وہ چلایا اور کوثر نے نزویک رحمی
چاڑو اخیلی اور دھردا دھرمانو پر برسانی شروع کر دی۔
اس نے مانو کھانا شروع ہو جاتا ہے، اس لیے ہر بار ہی مانو
کی طرح سوکھنا شروع کر دیتا ہے، اس لیے اہتمام سے جھاؤ
کیا ٹالی کرنے کے لیے وہ بڑے اہتمام سے جھاؤ
اپنی بھی مانو کا اسی بہانے مٹی، رست اور گارا کھا کھا
کے ہے ولی، معمل کیا اس کی گیارہ سالہ تیرے نہ سکی
لیکن جو دلی ہی ہو جائے مگر جس طرح جمعی اور کاچی
لے دیاں اور کیا شام کی طرح لکھتے تھے، اسی طرح
بھاڑو بھی شاید کسی بیک کا کام دستا تھا۔ وہ اور بھی
بھوکی جارتی تھی۔ ایک دن و سارے کالی کلوٹی جستی
آنکھوں والی رانی پر جو پھر دھوکہ دیا تھا، جتنا بھر دی
مکراہٹ کھلنے لگتی پھی۔ اپنی شکایت کے اس بھرپور
اور تسلی بخش رو عمل پر۔

”لعل! بتی جادوے، انہیں ہم کیا سے“ کاشت
نے اس مارکٹیل کے عمل میں دخل دیا۔ ہم مارکٹیل میں
سات بیک تک اس گھر میں بتی نہیں جلتی تھی۔
مالانکہ وہ گرو جو اچھی بھلی کو ٹھری تھا، وہاں دن کو بھی
پھر بتی جادوے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اسی لیے پہ واحد کو ٹھری
کمی استعمال میں آتی۔ سارا دن اس محقر سے محن
میں گزر جاتا، جہاں قدرتی روشنی سے تک تک کام
چلانے کی کوشش کی جاتی، جب تک رات کے
انہیں گھر نہ ہو جاتے۔

”بھی مغرب نہیں ہوئی، تیرا پو آگیا تو میری مان
وہن ایک کردے گا کہ بھلی ضائع کر دی ہوں۔“
”تو اور آنے کے تھی لکھے کاشی! اور جو لے کے
ہان کی بڑی روشنی ہے۔“ مروفال نے اسے اپنے

کبھی ساتھ واے گھر کی گورت بھکت منہ کے
تحا۔ کہاں وہ کھر کام کرنے جائیں تو اور رات سے
تو راجپوت نسل کی نئیں گھر میں کڑوں والیں ایجٹ نسل
کی ہیں۔ وہ لوگوں کے فرش پر پہاڑتے یا اس کی
گندی انہوں میں تماشہ بننے والی نیں۔
اس نے وہ تقریر کی جو وہ مشتعل میں دھمن ہے اور
ہی کرتا تھا۔ مروفال نے اپنی تاکواری پچانے کے
منے تقریباً ساریں انہوں میں دے رکھا تھا۔ الیسا
منہ کے زاویے بھی پیڑھے ہو رہے تھے، اپنے سا
اس کے ہاتھ سے سو کا گاہ پکڑتے ہے۔ اسکی
نظروں سے اسے دیکھا۔ مروفال کی ثابت ہے بھر
بھرے جسم کی مالک تھی۔ اس کی انعام بھی اپنی
بھر کے مروفال کے تو بڑے ہونے کا سے پتہ ہے۔
درج کے کل معمول سے زیادہ سیاہ رالی کیں گلہیں
طرح آنکھوں میں ہٹتے ہوئے تھیں۔
”یہ سرمه کیوں ڈالی بھر دیوں میں ڈال کر
”اس نے پڑا ساحو خود پرے کے بعد سال

لھڑا چو لے کر اندر جھپٹ پھی تھی اور رانی ستو کا
شربت بھائی کے لئے ٹھر گھونک لے گئی۔
”یہ ہمی خصوص کس خوشی میں ہو رہا تھا؟“
”نے آتے ہی انکو تھوڑی آنکھیں ایک ایک کے چھرے
پر گاڑتے ہوئے تفتیش شروع کی۔
”کوئی نہیں۔“ کوڑ نے صاف مکر جانے میں ہی
عافیت جاتی۔

”ادھر کے فرمت ہے بٹنے کی۔ ہاں یہ مانو گر گئی
تھی، وہ ہی گاچاڑ کے بھیں بھیں کرہی تھی۔ یا لے!
ترے تو اپ رونے اور بٹنے میں فرق ہی نہیں لگتا۔“
”زیادہ بکواس نہ کر، سارا انداز کونے میں لگا کے آتا
ہوں،“ یہ چلی ہے مجھے کونے میں لگانے۔ بتا کیوں نہیں
آہلی پڑھی ان کڑیوں کی۔ کمال سے سمجھ کر کہا
ہیں؟“ اس نے کوڑ کا پانزو زوبھتے ہلایا۔ سارے دن
کی محنت مزدوری اپنے پچھلے ایک گھنٹے سے سبزی
باتنے کے بعد اس کے سے دیے ہی اکڑے ہوئے
تھا ب تھیں کے رہے اس کی جنگنگل گئی۔
”مکر نہ سے تو بھائی کی پانزو زوبھتے ہلایا۔“

”آنکھوں میں رڑک (خالیں) ہو رہی تھیں ایا؟“
اصل وجہ یہ تھی کہ پوشش جانے کے بعد اسے
سیاہ رنگت اپنے بھیکی آنکھیں بری لگنے لگیں اور
آن کو پھینانے کے لیے آئے دن کوئی تکمیل کی
رہتی تھی۔ یہ سلاسل ایں بھر بھر سرمه اسی لیے بھرا غار
ان کی سیاہی میں الجھ کر آنکھوں کا بھینگاپن کی کوئی ملیں
طور پر محبوس نہ ہو۔
”تیری رڑک تو میں نکاتا ہوں۔“ اس نے گاہ
خالی کر کے اس کی جاتب اپری طاقت سے پھینکا دیجے
ہے۔ اس کی کشنی تابے کے بھاری گاہیں کی نہیں
آئیں۔ وہ درد سے دو ہری ہوتی لب دیا کے جی ڈی کی
وہیں پھی مٹی کے صحن میں بیٹھنے لگی۔
”گھر آکے بھی تیر اسرا دھیان ان ہی کو صحیوں اور
ان کے صاحبوں میں ہی انکار رہتا ہے۔ اپنے بیل پکھوں کی
فکر رہی نہیں۔ کیسے ہاتھ سے نکلے جا رہے ہیں۔ ایک

چھ جن بھائیں آئی پھر کام بکار نے کے لیے کسی کڑی کو
تو اپنے ساتھ کوئی بھی نہیں لے گئی۔ اپنا کام بکار نے
کی خاطر میری عزت تو ہیں کیا کر آئی۔“
”یا لے! وہ میری بھی بیٹیاں ہیں۔“
پرست (تفیش) کرتا ہے جیسے میں ان کی مال نہیں کوئی
لڑکیاں بیچنے والی لکھی ہوں۔ اگر کسی دن ساتھ لے بھی
گئی تو اپنے پلو میں پچھا کے لے جاؤں گی۔ جیسے مرغی
اپنے پر میں اپنے چوزوں کو لے جائی ہے۔ آخر آنڈی
گوانڈی (آس پاس) کی لکنی زنانیاں کریاں ساتھ لے
کے جاتی ہیں۔“
”لے جاتی ہوں گی۔ اچھی طرح جانتا ہوں میں ان
زنانیوں کو بھی، ان کی کڑیوں کو بھی۔ اور ان کے
گھروں کے بے غیرت مردوں کو بھی۔ میں اقبال دین
راجپوت ہوں۔ ان کی طرح چوڑا پھر انہیں۔ یہ تو
غزت نے یہ دن وکھا دیے، ورنہ راجپوتوں کی عورت کا

بچھلائی تکروں سے مل کو دیکھنے ایک وہ تکریں ہو "مُحُوكْ بُوْكْ" پڑا رہی تھیں۔ کوڑتے تکریں تھیں ایں اور کمیں سے تھیں جو حادثہ کے ایک پڑا بر آمدی جس میں چار لاٹھیاں لندھیں۔

"کپ سے دیجے بیا ہوں تو چار لفڑاں کو کے بیشا

بے رہتے میں دل نہیں لکھا ایک خدا کا کاشش بھی نظر کرم ہوئی تھی۔ اس کا دل جیسے زور کا دھکا کھاڑ آکے کی طرف گرا۔

"ایا! اغایی کام ماتھا۔" منتا قی آواز میں اس نے جواب دیا۔

"تو کرنے کیا جاتا ہے اسکول؟" تھی فیس لے کے یہ دولا نہیں لکھنے کا کام دیتے ہیں۔ اپنے تو توکر کا دوسیں پاس بلکہ پہلی جماعت سے ہی آگے انکل جائے تو پڑی بات ہے۔

"ایسا سال میں دو شرکی یونیورسٹی کا امتحان رہتے والا ہوں۔ تیری میں جاؤں۔" میں بیک بات یوری ہونے سے پسلے ہی پالے نے اتنی بڑا ہی پل گھما کر کامیابی سے درجہ بیساکھ رائی کیا تھا۔ چل ٹھیک اس کے منڈپ پر گئی۔ چاہے میں ڈینی ڈانتی کوڑ کا پتھر کا نسب سا گیا۔ آئندہ سال کا شیڈ میں اس کی جان بھی۔ وہ زبان سے پھٹکی کیتی گئی مراس کے بھولے بھالے مخصوص چھرے پر لکسا تھیں پارنے کی بھی ہتھ نہ ہوتی تھی بھی، اور یا لے کو یہ تمڈھاتے دیکھ کر وہ سوائے دل ہی دل میں صلوٰاتیں سننے کے اور کیا کر سکتی تھی۔ اب بھی وہی کی کر رہی تھی۔

موبا۔ ہاتھ نوں کم بجت کے جو سامنے نظر آتا ہے، کھینچ مارتا ہے۔ کڑی باندھ کرے بیٹھی ہے۔ اچھا بھلاونی گلاس دے مار لڑکی ذات کو۔ کوئی لفڑ ہو گی توکر نے یوچھنا ہے، پسلے ہی وچاری ٹھلل کی ماڑی ماری۔ ڈر کے مارے وچارہ رو بھی نہیں پارتا۔ اللہ کرے بچھے بھی کسی کی جوں لگے موئے۔ میری اولاد کو دکھ دینے والے۔" وہ اندر ہتھی اندر غصے سے حوال

چیل کے "اب اس نے کوڑ کو طمعت دینے کے مانع ساخت خاموش تیغی موقاں کو بھی گھیٹ لیا۔" کوڑا میں سوئے کے تجاتے کیا منسوبے بنا تی دکھلیں ایک دن سوئے اس کی بھی خالی تھی۔ وہنا ایک دن سوئے اس کی بھی خالی تھی۔

"خدا اللہ۔" موقاں نے دل ہی دل میں پورے پنپے کے کما اور تاے سے پھولی ہوئی بعلی امار کے چمگیں، گلی۔ کوڑے میں سالن نکال کر دل کو لے چل جیا ہے کاشہ کر دیا۔ اس نے آج ہی باوں میں مندی کھل جیا ہے سرزوہ کا ہونے کی وجہ سے شاید چھپی رہتی تھیں جب رہتے میں مندی سے الگیاں جو لال ہو گئیں جسیں دبائے او جملہ رہتیں اس لے اس نے دکھلنا آگے رکھنے سے گریزی کیا۔

کافِ حقیقی کھنے کے دوران گلچھلے کے دل ایک سے امیں جاتب دیکھی چاہیا تھی۔ آتی باتی مار کے پیٹھے بآپ کو بھی چھلیتھا جا جو روئی کے بڑے بڑے تھے دل میں ڈال رہا۔ بواہ ہی کی کی ذات پر کوئی جات کیا جانے والا نہ ہے۔ اس دل کے دل میں ڈال رہا۔ بارہ ہو جاتی اور کوچھ پل کے موقاں میں ہے۔ دسری روئی پتکر میں ڈال رہتی۔ گرم گرم تازہ روئی کی ملک کافی بھوک کو بھی چھپ کرنے لگی۔ مانو کی بھوک سے کچی تھی، وہ اگر پیت بھوک کی تھی۔ بیٹھ جوکر کی کھلاتے دلکھ کے رال پکانے لگتی تھی۔ اب ہو توکر کی کھلاتے دلکھ کے رال پکانے لگتی تھی۔ اب بھی روپا ہوتا اور جھاڑوکی مار بھول کے کوٹھری کے کواڑ سے اپنا تیل میں ڈالا اور جوؤں سے بھرا سر نکالے دیکھ رہی تھی۔

"کچے ڈال۔" کھاپی کر چلتی رہے کرتے ہوئے پالے نے بھوکیا اور لمبی سی ڈکار لیتے ہوئے دوڑھپتی کا آرڈر دیا۔

"الاچھی ڈال دننا ہاکہ کچے ڈالے کھانے سے پیٹ میں رونٹ شروع ہو جائے۔"

چولما ایک ہی تھا۔ تو امار کے چاہے کی دیکھی جو لما ایک ہی تھا۔ وہ اسے کے اس پار مانو مایوس ہو کر پڑھلے ہی۔ دروازے کے اس پار مانو مایوس ہو کر والیں کوٹھری کے اندر ہرے میں گم ہو گئی۔ کافی بھی

رہی تھی یہ اس کاروبار کا کام تھا۔

”تیری میں جائے گا۔ تو رعب کس بات کا؟“
ربا ہے آج میں پڑھانا ختم کروں تو کیسے جائے گا
تیری میں۔

”میں۔ تیری ماں کے یار آکے تیری فیس نہیں
بھر جاتے، نہ ہی تیرے مائے یا باتا تیری کتابیں دے
جاتے ہیں۔ تیرے ناگلوں کی سات نسلوں میں کسی نے
کتاب تھی ٹھکل نہیں دیکھی۔ یہ میرا احسان ہے کہ
تجھے پڑھار باؤں، ورنہ بیٹھا ہو تا تو بھی کسی پچھروں والی
دکان تھی کام لے سکتے یا پچھر کسی تورے گاہوں کو گرم روپی اور
سانان پڑھانے کے لیے سجدتی طراں پڑھتا ہے تو
ہتا۔ یہ گذیاں اڑاتا، کنھے ھلپتا، باروں ووستوں کے
ساتھ پھرتا ہند۔ آج کے بعد تجھے قلی میں دیکھا تو خیر
خیں تیری، سمجھا۔“

اس نے خالی خونی زبانی سمجھانے کو کافی نہ جانتے
ہوئے اپنا ہتھوڑے جیتا باختہ اس کی گذی پر رسید
کیا۔ کاشف بلبل کے رگیا۔

”درگیوں کی طرح“ باتے۔ اولیٰ کیوں کرتا ہے؟
راجپوتوں کے کھنڈ پر کیا تھا؟

یالے نے اپنی کے احتجاج پر طیش میں آ کر اس کا
مشقی سا بازو مروڑا لائیں پار اگرچہ کاشف نے چھینے
کی عطا نہیں کی تھی مگر کھنڈ پر کے ضبط کی
انتہا کیا ہو سکتی ہے۔ اس کا اندازہ کوئی اس کو دکھو دو
میلے رہتے چھرے اور باہر کو ابتدی آنکھوں کو دیکھ کے
قریکتی تھی۔ اس کی پلکیں نہ ہو کر حماری ہو گئیں۔

آج پھر وہ لباچکر کاٹ کر اس راستے سے گزر رہا
تھا۔ کتنے ہی دن پسلے وہ مجبوراً ”بڑی سڑک سے اس
لیے گزرا تھا کہ اسکوں سے اس کے گھر کی طرف جانے
 والا منحصر مگر کیا راستہ رات بھر مسلسل بارش کے بعد
کچڑا اور گارے سے لٹ پت تھا۔ کئی گروہوں میں توپیاں
کھڑا تھا۔ کوثر نے اسے سمجھتی سے کھاتھا۔

”بڑی والی سڑک پر جاتا اور واپسی پہ بھی وہیں۔“
ناچار اسے بڑی سڑک سے آتا یا۔ حالانکہ وہاں کی

زلف اسے خاصا ہوا تھی۔ مراکشی کاٹ کے چینی کی
تک جاتا محال لگتا ہیں ایک چھوٹی سی دہلی سسی
کش نے اسے مجید کیا کہ وہ وہ کمرے کا کٹھا
کے گزر رہا تھا۔ حالانکہ دونوں گواکے دھمک پھیلی
تھی جس نے سارے ایچھے سکھا کے ٹھکل کر دیا تھا۔
راتے میں آئے والے پڑے سے ہمیشہ بہتر
میں رنگ برلنے عجیب سے جو گول والے بسیار
بلبوس اور جھرے پے کلی ماوس کامیک لکھ کر پڑا
بچوں میں نافیں پانٹھا تھیں۔
اس شخص نے فوراً یہی اس کی توجہ کھیل جانی
خاصی صروف شاہراہ تھی یہ اور اس پر بنا یہ بھی
پہنچ بھی اتنا ہی ریٹ لیتا تھا۔ وہ سر کے آس وقت بھی
ایک گاڑی جاتی تھی تو تین آٹی تھیں۔ زیادہ تر اگر
بھول کر یہ اسکوں سے لاربے تھے جو تھی در عکس
پیشوں میں لڑکے جو کروں جیسے بس اور کم ملکی
کے ہستے مکرات ملک ملک خوش گاڑی میں بیٹھے
بچوں کے ساتھ چھلپیں اور اسکی جیسا کرتا ہے بھی ان
کے مال لاؤسے سلا تا۔ زیادہ تھوڑے بچوں کو کوئی
کاروں کے کھلے کھلے کے کھلے کے کھلے کے کھلے
کی پیچی یہ پولی ٹکل ہو لے جو کہنے پڑتے اسے بھی
ڈامک وائل ریٹ کل کر کے کھلے کھلے ہے باجاتے کر کھلپیں
میں انھا کے چالی ڈالکے گھلوٹے گلی طرح ڈھنکے کے
امیں نہ تسلی بڑے بڑے پیلے کاروں الالی جھاڑاں
بزرگ حصہ بھی بڑی ہی نہیں جیسے میں سے میکھی گولیاں
بھی نکال کر تھیا۔

وہ کتنی بھی ویر کھڑا اسے دیکھا رہا۔

ایک کے بعد ایک گاڑی آٹی تھی۔ وہ درجنی
بچوں کا مل بسلا تارہا مگرہ تھکا۔ کاشف اس دیکھ رہے
تھے تھک کیا تھا مگرہ نہ تھکا۔ کتنی بار اسے ستائے
کے لیے بیشناو دیکھ کر کاشف سوچتا۔ اب یہ ہو گالی
آتی ہے اس میں بیٹھے ہوئے اس نے کوئی پیار کرنے
بالکل نہ ائھے گاجو ٹھکل سے تھی اتنا بد تیز لگ رہا ہے مگر
وہ حیران رہ جاتا جب جو کرڈھنگ سے ستابا جی نہ پا
اور فوراً کھڑا ہو جاتا۔ نئے جوش و خروش سے نہ پا

اور بہانے کے لیے

"ون میں کتنے بچوں کو پیار کرتا ہو گا یہ کسی ماوس سکر
نہ اس کاول بھرتا ہے نہ تکڑتا ہے نہ ہی یہ عکسا
ہے لتنا اچھا ہے ناٹھی ماوس!"

اس نے اپنے سامنی زبان سے کما جو اس کے برابر
والے گھر میں رہتا تھا اور اس کے ساتھ ہی اسکوں جاتا
تھا۔

"پاگل یہ کوئی بچ ج والا کمی ماوس تھواہی ہے
اصلی والا بندہ ہے منہ پر چھبھلا ہوا ہے" اس
نے اپنی قابلیت حماڑی۔

"جو بھی ہے لیکن ہے تو اچھا نہ۔ اتنا پیار کرنے والا
کاش یہ میرادوست ہوتا۔"

"لے یہ کوئی تیری عمر کا ہے پتا نہیں کتنی عمر کا
ہو۔ میں سال کا۔ میں سال کا۔ پھر پیش ہوں
کا۔ تیرادوست کے ہو سکتے ہیں؟"

"ہاں، واقعی آجھے نہیں یہ لتنا بڑا ہو، دیکھنے میں کیا
لگتا ہو۔" اچاک اس کے دل میں اس کا اصل چھرو
دیکھنے کی خواہ تھی۔ اس کو

"لیکن ایک بھائی ہے والہ، یہ پھر بھائی ہے۔
لے یہ کوئی بچ ج والا کمی ماوس تھواہی ہے۔

بن سکتا ہو مگر تم ادل چاہتا ہے کہ یہ میرا کچھ نہ کچھ
ضرور بننے چاہئے کے پچھے نہیں لکتے پھر بھی
انہیں لتنا پیار کرتا ہے اس کا کچھ لگاتا تو پھر یہ
مجھے کتنا پیار کرتا۔"

"پاگل ہے تو بھی۔ چل اب میں سال سے دیر
ہو رہی ہے" زبانے اسے چھیچا۔

اس دن کے بعد بھی وہ کئی بار صرف اسے دیکھنے کی
خاطر وہاں آتا رہا، وہ اسی دلجمی سے بچوں میں صحبتیں
بانٹنے میں مصروف نظر آتا۔

اسے دیکھتے ہی کاشف کی آنکھوں میں حرمتیں
یہاں سے وہاں تک پھیلنے لگتیں۔



"ارے بھی بیا! آپ اوہر کیوں نکلے۔ چلو شباباں،
اندر چلو۔ یہاں بست گرفتی ہے۔"

جلاک اس کا اندازہ لجھے اور میٹھے الفاظ نہ تھے
”بینی بیبا کو کرمی لگ جائے گی“ بینی بیبا بتا رہا جو جائیں
کہ ”مسلسل اسے پچکار رہا تھا۔
کیا افضل بکواس کر رہے ہو؟“ بڑی بیکم صاحب
بینی بیبا کی دادی تھیں۔ پتے نہیں کہ باہر نکلیں اور
نگواری سے بیالے کو جھاؤ کے رکھ دیا۔
ہی منوس قسم کی رث لگا رکھی ہے اقبال دین! تم

وہ شاید خاصی وہی قسم کی خاتون تھیں جو اس کی
بات دلت قلم لے گئی تھیں۔
”وہ بیکم صاحب! بینی بیبا دعوپ میں باہر آگئے تھے
میں تو انہیں اندر بینے واسطے کہہ رہا تھا۔ میرے من
میں خاک بینی بیبا کو تو میری عمر بھی لگ جائے“
راجیوت سل کا چشم و چراغ اس وقت ہی رات اور
صدقة مانگنے والوں کے سے لندن اگریں جھوپ اخھا کے
رعنایر ہوئے رہا تھا۔

آخر سالہ کاشفت نے آنکھیں چھاڑ کر اور منہ کھول
کے بڑی حررت۔

”کھکھا رہا تھا“ ملے کے ہاتھ اس وقت
بنا لکھ بنا لکھ اخھا لیتے ہوئے ملے کے ہاتھ اس وقت
بندھے ہوئے تھے۔ تیوریاں پر جھلک کر کھا جانے والی
نکروں سے دیکھنے والے پر اس وقت سر قابو پر کھا جاؤں۔
یا اکساری چھائی ہوئی تھی۔ اپنی اولاد کو بھول کے بھی
میٹھی نظر سے نہ دیکھنے والا اچانکہ ہی ایک بالکل

انجان، یا کل غیر پچے کے لاڈ اخھا نے گا تھا۔

”چلو بینی بیبا! اندر چلو۔ بالے چاچا کی گودی میں اندر
چلو۔ چلو۔ بالے چاچا بینی بیبا کو بھوڑا بن کے
وکھا میں گے“ وہ اس روتنے چلاتے چھے کو گود میں
اخھا نے اندر جا رہا تھا۔

ابھی کاشف جی بھر کے حیران بھی نہ ہو پایا تھا کہ
ایک اور منظر اس کے سامنے تھا۔ ایک چوہہ پندرہ سالہ
سخت مند اور خوبصورت سی لڑکی اپنی پولی نسل جھلاتی
باہر نکلی۔ اس کے بھرے بھرے بھم یہ داشت چست

ڑاؤز رہ اور سلیو لیس شخ رنگوں کی فنگن والی شرٹ
تھی۔ میک اپ اور جیواری کا بھی مناب استعمال کیا تھا۔

”ڈرائیور ڈرائیور!“ وہ آخری سیڑھی پر لبی
جیل والی سیندل نکلے اور ہر سے اوہر انقلبات میں
مصروف مانیں اور انسری پر میجنٹ والے اشاف میں
سے ڈرائیور کو ڈھونڈ رہی تھی۔

”بے! کل زمان کو بڑے صاحب نے آفس بلویا
ہے“ بالا بینی بیبا کو اندر آیا کے حوالے کر کے آیا
تھا۔

”اوہ۔ صدر کو بھی ہامہ رکیٹ لے گئی ہیں۔ اب
میں اپنی فرنڈ کی طرف کیسے جاؤں؟“
”قیس لے جاتا ہوں ہے لی۔ اپ بڑی بیکم صاحب
کھالی والی کاروں کی جال لے آؤ۔“
”شیور! تم ڈرائیور کمپلینگے نا!“ وہ کچھ مخلوک
تھی۔

”جی بے لی! آپ فکر ہی نہ کرو۔ بوب ایسا کے
ہو سکتے کہ ہماری موسموے لہتا ہو کے آئیں اور
بیکھنے والیں کافیں ہوں گے۔“ مسلسل ملکہ تھا بیوی کے ہوتے
ایسا ہوئی تھیں لکھ۔ ہم جھلانی موسموے لی کو ادا اس
وکھے کہتے ہیں۔“ وہ مسلسل ملکہ تھا بیوی کا شف کوہست
اپنی اجنبی سالگ رہا تھا۔
”کاشفہ ڈال کے پوچھا۔“
”لے لو اسے بھی سا تھے۔“

”نہیں موسموے لی! رہنے دیں۔ بڑی بیکم صاحب
تاراض ہوں گی۔ اسے کمال تھیں سے ان بڑی کاروں
میں بیٹھنے کی۔“ وہ اپنے بیٹھے کو یکسر نظر انداز کرتے
ہوئے ڈرائیور کی سینجال رہا تھا۔

”ابا کو اس فیشنی لڑکی کے رہنے ہوئے تھا من اور
ہوت نظر تھیں آئے؟“ ملے ہوئے بال نہیں دکھائی
وئے؟ اس نے دوپتے صحیح طرح سرپر توکیا لیدا تھا۔ کھلے
میں بھی نہ ڈالا تھا پھر بھی ابا کئے پیارے اس سے بات

بھردار تھی مل وہ مل نہیں۔

کربا تھد۔ وہ تو کہتا ہے مجھے ہوت اور تا خن رجھنے والی لڑکیں زہر لگتی ہیں۔ موقوف پانی اور رانی مانو کو ہر وقت جھٹکاتا تھا۔ وہ من دھوکہ پاؤڑ رہیں گاںس تو انسیں باری چھاتی ہے۔

گھرواتی پھر یہ ساری پانی مل کو جائے پھر نہ رہ سکا۔ اس کا خیال قاس کی زیالی اپنے فصلے شوہر کی زم مرا جی اور پر اپنے بچوں سے لاؤں کی بات سن کر وہ بھی اتنی ہی حیران اور اداس ہو گی بھت اک وہ گھر کو شرمنے سن ان سی کرتے ہوئے پوچھا۔

"تھے روعل تو ہیت بھر کے کھائی؟ کیا کچھ تھا کھانے میں؟ الحندی بول لی؟"

"ہاں ملی۔ پر اماں! میں کیا کہہ رہا تھا؟" ایسا سے خاص دیپسی نہ تھی۔

"وہ ایسا گھروالے اپنے جھوٹے بھا۔ وہ تو وہ سراہی تھا، بالکل دوسرے جھیکھ کر کھل اور۔"

"ہاں تو وہ کوئی اور ہی تو تھا۔ وہ تیرا بیا تھوڑا ہی تھا۔" دیکھ ام طالب دیکھ ام طالب

"پاچک! بیانیں کیوں کیوں تھیں؟" اس کا سارا سارا ملن گھی

نہیں۔ وہاں تو وہ اقبال دین چوکیدار ہے۔ ان کے درجن بھر نوکروں میں سے ایک۔ ان کے دو چوکیداروں میں سے دن کے چھٹی نوکری کرنے والا۔ وہاں اس نے کس کو ابا بن کے دھانکا تھا۔ وہاں تو وہ چاکری کرنے کیا تھا۔

"تو کرنے کے لیے بد لانا ضروری ہوتا ہے؟" بہت سونے کے بعد اس نے سوال کیا جو اس کی عمر اور زہن کے لحاظ سے خاصاً ویزی تھا۔ اس کے سر میں کڑوا تیل لگاتی کوڑ کے ہاتھ ہم سے گھنے چند سکنڈ اسے کوئی جواب نہ سوچا۔

"بس پتہ! اس نے محمدی آہ بھری۔" تو کرنے کی تے خڑ کیسے؟

یہ تھا وہ کاشف کو ہتھم نہ ہوا لیکن اس نے مزید کوئی سوال نہ کیا۔ اگرچہ اس کے سوالات کی ابھی تک

50

"آج پھر تو ہی سڑک پر پہنچا ہے۔
اس کا سخ دسری جانب دیکھ کر راہ میں اس
ارادہ بھاٹ لیا۔

"باز آجایا راتی کاڑیاں ہیں اور تو مدد افسوس کے
پاندرے میں اکی دھل دالے کو دیکھے جاتا ہے تو ہر چیز
سے کی ہیں کی بس کے نیچے آجائے گا مدد بھی ہے۔
سائولیاں تالی دھلتے رہتا ہے تو اس پر اکام رہتا ہے۔
"بس وہ تھے اچھا لگتا ہے وہ بے ہی اچھا۔" وہ
نے زبردستی اسے اپنے ساتھ کھیلا۔

"پاگل کے بھجے تھیا تو سے وہ اس کی اصل دھل سکی
سے ہو سکتا ہے اس کی اٹھی دھل اتنی راہیں کر کر
تھے دیکھ کر جائے ہوں۔ اچھا لگتا ہے۔"
"ہم لے کر کھلکھل کر مجھے اس کی دھل اتنی کھی
سے ایسی بھی بھلی شکیں پہاڑوں میں مل جاتی ہیں
کوئی بھی منہ پر لگائے مگر کوئی اتنا رکر کرنے والا نہیں
پکوں لوئیں اور تھیں تھیں تھیں تھیں۔ سارا سارا ملن گھی

کرتا ہے، میں بھی بڑا ہو کر لیٹا ہی جو کر ہوں، اسی
طرح بچوں کو پار کر دھل اور دھننا میں ایسا ہی کوں
گا۔"

"اوے تو بو کرنے کا؟" زائد کھلکھلا کے پس پا
گھراب کا شفت نہ اسے سن رہا تھا۔ نہ دیکھ رہا تھا۔ اس
کی ساری توجہ جو کر کی جانب تھی سو گاڑی میں سے
سال دُڑیہ سال کی ایک بچی کو نکال رہا تھا جو بھی میں
رو رہی تھی۔ جو کرنے اسے اپنی گوئی انجا کے اچھا
ناچھا شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ وہ کوئی گیت بھی نکلنا ہا
تھا۔ روئی ہوئی بھی چپ ہو گئی۔ آنسو اس کے گاڑی
ہم سے ٹھکے تھے اور اب وہ اپنی بڑی بڑی حیوان آنکھوں
میں دیچپی سیئے اس کی حرکتیں دیکھ رہی تھیں پھر اپنے
اس کے معصوم چہرے پر مستراہت ایک کلن کی میں

آدھا کچا اور آرھا کچا تھا۔

”چل گھر دیکھ لیا۔ اب آپس چلیں۔“ مگر کاشف ہاتھ پھڑا کے آگے بڑھ گیا۔ نٹ کا پروزرا سا ہٹا کر اس نے اندر جما لکھنا چلا۔

”بے غیر قوے کوارہ کتے وکھڑی آرام نہیں لینے دیتے آتے ہی جج جج نکاری ہے۔“

وہ اس کی عمر کے دلڑکوں کو کار سے پکڑے جھکٹے دے رہا تھا۔ اپنے یادوں میں انھا کے روئے پھوٹوں کو چپ کر دیئے والے ٹھنڈ کے دلفوں ہاتھوں کی گرفت میں دو کم من بچ تھے جن کے چہرے دہشت سے سفید پرچکے تھے۔ اب اس نے ان کے گربان چھوڑ کر ان کے چھوٹوں پر دو دو چھپڑیں کر کے

”کتنی پار کہا میں میرے آنے سے پہلے ان کی سوں لو ماہر اولن مار دیا۔“ ہندو نے بھر کے بچے گلیوں میں رلتے پھرتے ہیں۔ ایک پیغمبیر جن کو چین میں۔ میری جان عذاب میں ڈالنے کو انہیں فخریہ فٹ کی کو گھری میں سارا دن رسیں لگائے تھے ہیں۔“

ایسا نہیں تھا۔ اس کی سوچ کے کام۔ ”جاوے باہر ہی میں ہو۔“ آرام کرنے والے مجھے۔ اس نے اپنیں یا قاعدہ دھکے دے کر اور لالہت رسید کر کے باہر نکلا۔ اتنے میں اس کی نظر پولے کی اوٹ سے اندر جھانکتے کاشف۔

”اوے ہون سے۔؟“ کپ کرو باہر نکلا اور کاشف کے بھاگنے سے پہلے اس کی گردن روچ جل۔

”تیرا یا رہے؟“ اس نے اپنے لڑکوں میں سے ایک سے پوچھا۔ نئی میں جواب ملتے پہ اس نے کاشف کو تھپڑا مار دیا۔

”پور لتا ہے محل سے۔ بتا۔“ کیوں اندر جھانک رہا تھا۔“

کاشف بے چارہ کیا بولتا۔ وہ توب بھی اتنا حیران نہ ہوا تھا جب اپنے ہر وقت غصے میں رہنے والے باپ کو بنٹی بیبا اور موسمیں کے باز خرے اخalta دیکھا تھا۔ تب بھی حیرت ہوئی تھی گرنہ تو اس کا دورانیہ اس

چھلے۔“ کاشف نے یوں فاتحات اور حاتمے والے ”نکھلے۔“ زاہد کو دیکھا جائے یہ کار نام اسی کا ہو۔

”اہم ازیں زاہد کو دیکھا جائے“ مگر ”زاہد کے کتنے پہلے“ تیرا جو کر اندر جا رہا ہے۔“ سروس اشیش کے عقب

کاشف نے بے چینی سے سروس اشیش کے عقب میں بنے واش روم کی جانب دیکھا۔ کاشف کے دل میں

اکابر پھر شدت سے اس کی اصل قہل دیکھنے کی تھی مل۔“ دل زاہد کے روکنے کے باوجود دیوار کے ساتھ لگتا

لٹا۔ دبائ جا پہنچا اور ایک بڑی گاڑی کی اوٹ میں لٹا۔ دبائ جا پہنچا اور ایک انتظار کرنے لگا۔ چند منٹ بعد

کھڑے ہو کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ ایک دلپلاڑا زردو، آدمی سے سنجے سرو والا آدمی واش روم کا

دیوارہ کھوں کے نکلا۔ اس کے ایک باتھ میں سکی ماوس دلماں کھا اور بازو پر جو کروالا بس۔ زندہ ہے شام

والا ایک تھا اور بازو پر جو کروالا بس۔ زندہ ہے شام۔“ اس نے تیر جیس اس میں پوچھا۔“ لے کے

انھا کے اس سے سلوٹ اسیل کافیں نکلا اور تھے تھے دیکھے پہنچے سے سلوٹ اسیل کافیں نکلا اور تھے تھے دیکھے

لے دوں سے چل پڑا۔“ ”اوے تو کہ درست؟“ زاہد نے اس کا پیچھا رتے دیکھ کے کہا۔

”چل آیا! اس پر کے پچھے چلتے ہیں اس کا لھرو ہجھے“

ایہ۔“ ”یاغ خراب ہے کیا؟ پچھے ہوں وہ کتنی دور رتا ہو۔“

”دور رہتا ہو گا تو ویگن میا بس پر چڑھے کا پھر، ہم امانتے راستے پر آجائیں گے اور اگر پیدل چلتا ہے تو اس کا

مطلوب یہ ہو اکہ اس کا گھر نزدیک ہے۔“ کاشف نے

تھے کی بات کی۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ وہ اسی پہلی

گئی میں مزدیگیا جس کے راستے وہ اپنے محلے کی طرف

لئے تھے۔ ان کے محلے کو جانے والی گلی سے پہلے والی

گلی میں وہ مرا تو زاہد کے منع کرنے کے باوجود کاشف

بھی پیچھے پیچھے چل پڑا۔ چند قدم چل کے وہ ایک ایسے

روازے پر رک گیا جو بالکل اس کے گھر کے دروازے

جیسا تھا۔ وہا ہی چیس چیس کرنے والا۔ اتنا ہی

بد رنگ اور اتھاں پر اتا۔ گھر بھی کاشف کے گھر کی طرح

قدرت طویل تھا اسی اثرات است دیریا۔ اس وقت تو کویا
وہ لگتا تھا اتنا۔

”آئے ہے رب نواز! ہمارے دو بیڑے کسی نے کیا
چوری کرنے آتا ہے۔ جانے دے،“ کسی غریب کا پال
(پچھے) ہے۔ اس کی وجہی نے سفارش کی۔

”پھل بھاگ جائیں سے“ آج کے بعد اس کی میں
نظرنے آتا۔ اس نے آکید کے طور پر ایک اور دھمکو کا
اس کی کمر دے دیا۔ وہ لذکھڑا کے درگر اور پھر زاہد
کے سارا دینے پر کپڑے بھاڑاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔



آج کتنے سالوں کے بعد وہ سوال کاشت کے سامنے
تعاب جو بچپن میں۔ بھی اس نے اپنی ماں سے کیا تھا۔ اس
سوال کا جواب اس کی ماں نے دیا تھا۔ اس کے بعد تسلیم
ہو سکی تھی۔

اس سوال کا جواب تھلات نے اسے رب نواز۔
اس۔ بھی ماویں دلے آدمی کے اصل رویے کی
صورت بھی روا یا حکم وہ جان سکا۔ سمجھتا اور جان لیتا
وہ بالکل الگ کیا۔

یہ تو وہ سمجھ کر یا حاکم رب نواز کو میوں سے پیار
ہیں کرتا بلکہ لوگوں کے سختے کے اخہانا، انہیں پیار کرنا اس کے
پیشے کا تقاضا تھا۔ اس کام سمجھا سے میے ملتے تھے۔

یہ بات بھی سمجھ میں آئی۔ میں کہہ کر میں ہرمات
میں اپنی چلانے والا، اس کا حامیت پنڈ اور سخت کیر
باپ اگر اپنے مالکوں کے بھوؤں کی بد تیزیاں میں کے
سیہہ جاتا ہے تو صرف اس لیے کہ اسے اپنی نوکری پیاری
تھی۔

مکروہ یہ نہ جان سکا کہ۔ ابھی ابھی ماونے کے گلے نے
اے آگئی کے اس موڑ پر اچانک لاحڑا لایا۔
میوں کی شادی آج سے دس سال پہلے ہو چکی
تھی۔ اب تو اسے یہ وہ ہو کر دوبارہ میے آئے بھی چار
سال ہو رہے تھے۔ جیسا شوہر اقبال دن نے بیٹی کے
لیے دھونیہ اٹھا، اس کا چھ سال زندہ رہنا بھی تو بڑی بات
تھی۔

رلنی جس کی دھکی دھو دھوت سے
جس کا گھر یعنے کی اسید بھی نہ کی جائے کی تھی
اے ایک اچھے کھن۔ بوس اور ایک بخوبی تھا اس کی تھی
جو ہی بن بھل تھی اور جھپٹے کی عمل مال سا پھر
میں مظہر نہ نہیں کردار بھی تھی۔

اقبال دن میوں کے یہ دھو دھوت کے پس پیار
ای مر گیا تھا اور اپنی تمام تر وسیع اور اس اور جھپٹے
کا شف کو سونپ گیا تھا۔ وہ اپ کھرا نے کام اس کو کھو کر
تمیں بلکہ واحد میو بھی تھا۔

کوڑا ب مرد پسند ہوئے کی وجہ سے کام لکھا کر
کے قاتل تھے بھی تھی۔ ہوئی بھی تو کاشت کو یہ کوار
تھا کہ اس کی ماں لڑکھر بر تن دھوٹے اور صفائح دھم
کرتی۔ آخر چوری میڑک پاس تھا، اس کی بھی چار لوگوں
اے بھی اپنے خالی گھر پر اپنی خون اورے کام کرنے میں
احساس تھا۔ میوں اپنے کھلکھلے دلکھلے میں میں میں میں میں
اس کے ساتھ تھن پھیان بھی تھی۔ چار افراد میں
اک بڑھی ماں ایک جوان۔ سارے دو سالوں کو خود

بجا بھوؤں کو کمائے میڑک پڑھتا۔ بھل بھی نہ
کہ گلے میں پھنداؤں کے سرخ جاتا ہے تھی میں
نہ تھا کہ ان ذمہ دہیوں سے چھکا کارا حاصل کر سکی
خاطر کسی فرار ہو جاتا اور چھڑی چھات بے کفر نہیں
گزارتا۔ لیکن وہ کوئی اوتار بھی نہ تھا۔
ایک عام انسان تھا۔

ایسا ہی عام انسان جیسا کہ اس کا باپ اقبال دن
تحا۔ کم حوصلہ، کم طرف، کم ہمت۔

یہ چھ نفوں جو اس کے رحم و کرم پر تھے اس کی وجہ
بن چکے تھے۔ ان کے پیٹ کے دونوں بھرنے کی
اے دن رات اپنا وہ وہ مشقت کی بھی میں جھوکا رہا
تھا۔ ان کی خاطر اسے اپنی معنوں سے معمول خواہیں
بھی بیے درویں سے چکنڑا تھی۔
یہ چھ نفوں اس کو خارکی طرح لکھتے تھے۔ شاید

"میری باتی جان! اپنے بھائی کی نامیں" چرخت
اپ۔ بہت اچھا لگے گا۔ وہ کسی کاکب کو قاتل کرنا
تحا۔ تو چادر کی لاکل میں پیدا و ہیں کوتے میں اس کے
فارغ ہوئے کا انتظار کرنے شروع ہی۔

"آئی جی! زیادہ نہ سوچیں" اپنے اس میٹھے پر احمد
کریں، لاکل کے رنگ ہیں۔"

"بخاری تباہی رنگ تناہی آپ کے لیے ہے"
"کیا میری بہنا۔ صرف ایک سوت تک از کم دو تو
لیں، لیں۔"

وہ بڑے منذب اور نئے تلے بجے میں اپنی گاکب
خواتین کو گھیر رہا تھا۔ در اس چھٹا تو اس کی نظر ہا لوپ
گئی۔ وہ چونک ساگیا۔ اس کی آنکھوں میں اسے ایک
حاتا بھاتا ساکر بکھر لے لیتا اظر آیا۔

"کیا ہے؟ اپنی میں اکھر لیجھے میں کوچھ کھینچ مار۔
آپ کو چھلا لیتا ہوں اور یہاں اچھاں مانا تو ایک
ٹرف، لیاظ تک رکھنا شعنی ہاتا۔ اب میں دوسرے
کھانے میں بازار کے ہاں پکوڑے یا پچھے کھا کے بیمار ہو
سے اسے جانچا۔

بھی بات رکھاے؟ تو یہ سمجھوں گلے ہے اس طرح

"کیا مطلب؟" اس نے تیوری جھٹھائی۔

"اس طرح یا رے بات کلاتے ہوئے تو برا اچھا گا
اور بھی اچھا لگتا اگر ہاں پرانی بہنوں کے بجائے اپنی سگی
بیویوں کے یا رے بات کرتا۔" اس نے اپنی محروم
نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔
"ای نس پارے۔" اس نے سر بلایا۔

"میری کیا لگتی ہیں جو میں یا رے بات کروں یا تو
میرا کام۔" شاید منہ میں نکل آیا تھا یا شاید زبان
وانتوں تلے آئی تھی، وہ رک ساگیا تھا۔
ایک انوس سا درواں کے چھپے پر پھیل گیا تھا۔
اس بچپن کا درون۔
جو بچپن وہ عرصہ ہوا جھلا جکھا۔

دیے ہی چھے بھی اس کے ابے کو لکھاتے تھے بہت کم
مری میں عملی میدان میں آجائے کے باعث وہ اپنا
بچپن فراموش کر چکا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی
بچپن کی ساری یادیں سارے محسوسات بھی۔
تج آنجانے میں ماں کے ایک بلکے سے گلے نے
اے وہ سچھ بیا ولادیا۔ وہ روز صبح دوپر کا مکھاں ساتھ
پاہدہ کے لاماتھا۔ ماں اس وقت سارے گھر کی مصالی
کر رہی ہوئی جبکہ موفاق ناشتے کے ساتھ ساتھ دوپر
کے لیے سالن بھی تیار کر لی۔ اور کاشت کا لفڑ باندھ
دیتی تھیں رات اس کی چھوٹی لڑکی بخار میں پتی رہی
کہ جس تک وہ اس کے پیشان کرتی رہی جس کی وجہ
کے کھاتا تھا، وہ نہیں دیر ہوئی۔

"کسی کو حساس نہیں ہیں سارا دن گرمی میں اسے
آپ کو چھلا لیتا ہوں اور یہاں اچھاں مانا تو ایک
ٹرف، لیاظ تک رکھنا شعنی ہاتا۔ اب میں دوسرے
کھانے میں بازار کے ہاں پکوڑے یا پچھے کھا کے بیمار ہو
باؤں کا تو کسی کا کیا جاتے گا۔"

"بس دس منٹ بیٹھنے کا کام کیا جائے؟
"رکنے والے رکنے دے۔ تو لڑا اخھا اپنے بچوں
کے میں تو بیگار ڈھونے فو والا خپڑے ہوں۔ بچلا ڈھنگروں کی
بھی کوئی پرواکرتا ہے۔" اس سخنے جائے کاکب دیوار پر
رسارا۔

"دس منٹ اور بیٹھ گیا تیرے ان آکھیوں کے
لیے تو اہر دکان کا مالک مجھے فارغ کروے گا۔ پھر روتا
مجھے سارا اسپر بیٹھ کے روتا میرا سیا۔" وہ بکلا جھکتا دیاں
سے نکل گیا۔ جس کپڑے کی دکان میں وہ کام کرتا تھا، وہ
اس کے کھر سے نزدیک بازار میں ہی تھی۔ پیدل کا
رات دس بارہ منٹ کا تھا۔ دوپر کو ماں و ستر خوان میں
کھاکا پیٹ کے اسے دینے آئی۔ خاصارش والا وقت
قفل دکان میں درجن بھر عورتیں ان تین لڑکوں کا سر
کھاری تھیں جو انہیں نئے سے نیا پرنس نکال کے
وکھارے تھے اور ان چرب زبان لڑکوں میں سے ایک
کاٹھ بھی تھا۔